قومی زبان کی اہمیت و افادیت

پاکستان میں ایسے بہت کم افراد ہیں جنہیں حقیقی طور پر معلوم ہو کہ قومی ترقی کے صحیح ذرائع کیا ہیں اور خصوصاً تعلیم ملت میں قومی زبان کا کیسا درجہ ہوا کرتا ہے۔ چنانچہ جن پیش بیں شخصوں کو قومی زبان کی اہمیت کا احساس ہے وہ دیوانے سمجھے جاتے ہیں۔ حالانکہ یہ وہی لوگ ہیں جو:

پھیلا رہے ہیں نور دل داغ داغ سے
ظلمت میں شب کی مہر درخشاں لیے ہوئے

قومی زبان کو قومی زندگی میں صحیح مقام حاصل ہوئے بغیر قومی یگانگت پیدا نہیں ہو سکتی۔ نہ قوم کے دماغوں سے احساس کمتری دور ہو سکتی ہے نہ خود اعتمادی پیدا ہو سکتی ہے نہ ملک اور قوم مستحکم ہو سکتے ہیں اگر اس ذرا سی بدیہی حقیقت کو سمجھنا کسی ملک میں انتہا پسندی، عاقبت نااندیشی اور جنون ہے تو اس ملک کے خیالات اور آراء کی کج روی کا ماتم کرنا چاہیے قومی وحدت اور یگانگت پیدا کرنے کا موثر ترین طریقہ یہ ہے کہ قومی زبان کی ترویج ہو تاکہ فکر و ذہن کی یکسانیت قائم ہو سکے اور ایک دوسرے سے محبت کا جذبہ پیدا ہو۔ حقیقت یہ ہے کہ وطن دوستی اور زبان میں بہت گہرا تعلق ہوتا ہے۔ زبان محض اظہار خیالات کا ذریعہ نہیں ہوتی بلکہ قوم کی تمام روایات کی حامل ہوتی ہے اور اس کے بولنے والوں کے ایک ایک لفظ سے ایک قلبی تعلق رکھتا ہے۔ اس لیے اگر ایک قومی زبان کی ترویج ہو تو اس امر کی امید ہو سکتی ہے کہ پاکستان کے مختلف علاقوں کے درمیان جذباتی تعلق اور گہرا ہو جائے۔

زبان کا کردار پر بھی گہرا اثر ہوتا ہے۔ چونکہ ہم اپنی زبان کو حقیر سمجھتے ہیں۔ اس لیے اپنی ہر چیز کو حقارت کی نظر سے دیکھنے کے عادی ہو گئے ہیں۔ ہم سے زیادہ دنیا کی کوئی زبان احساس کمتری میں مبتلا نہیں ہم میں قومی خودداری کا نام نہیں۔ لے دے کے ہم زبان سے اسلام کی برتری کا اعلان کرتے ہیں مگر دراصل یہ ہمارا فرار ہے۔ ہم دل سے اسلام کی برتری کے بھی قائل نہیں ہیں اگر ایسا ہوتا تو ہم ہر روز اسلام کو ایک نئے سانچے میں ڈھالنے کی کوشش نہ کرتے۔ جہاں تک ہمیں اپنی ثقافت سے تعلق ہے وہ اظہر من الشمس ہے ہمارے نئے گلی کوچوں کے نام اکثر غیر زبان میں ہوتے ہیں۔ اداروں کے نام غیر زبان میں ہیں ایسا کم ہوتا ہے کہ ہم کسی مجلس میں کسی شخص کو اپنی زبان بغیر انگریزی کی آمیزش کے بولتے ہوئے سنیں۔

یہ تمام چیزیں اصل میں آئینہ دار ہیں اس گہرے احساس کمتری کی جو غلامی کے زمانے میں ہم میں پیدا ہوا تھا اور کسی طرح ہمارا پیچھا نہیں چھوڑتا۔ ہم اپنی ہر چیز کو حقیر سمجھتے ہیں اور باہر کی ہر شے کو بہتر سمجھتے ہیں۔ پاکستانی مصنوعات پر باہر کی خراب چیزوں کو ترجیح دیتے ہیں۔ اب نہ اپنی زبان اچھی لگتی ہے اور نہ مصنوعات، ہمیں اپنے دل کی گہرائیوں کو ٹٹول کر یہ سوال کرنا چاہیے کہ اگر ہمارا احساس کمتری زیادہ عرصہ تک قائم رہا تو کیا ہم اسلام کو بھی

Scanned with CamScanner

برتر سمجھیں گے یا ان اقوام کی روایات اور اقدار کو اپنالیں گے جن کی برتری کا سکہ ہم نے اپنی نااہلی سے خود اپنے دلوں پر بٹھالیا ہے۔ کیا محض نام اور جغرافیائی حدود کسی قوم کی بقا کی ضامن ہو سکتی ہیں یا افراد کے ایک پراگندہ ہجوم میں روح دوڑانے اور انہیں لافانی بنانے کے لیے ان میں افتخار و اعتماد کو نشوونما دینا ضروری ہے؟ ان مقاصد کے حصول کے لیے اپنی زبان سے اور اس کے ذریعہ اپنی روایات' اپنی تاریخ' اپنے ماضی' اپنی اقدار اور اپنی ثقافت سے محبت پیدا کرنے سے ہی ممکن ہے۔

کیا اردو اس قدر بے مایہ ہے کہ وہ قومی ضروریات کو پورا نہیں کر سکتی؟ زبان کوئی عمارت نہیں جسے پہلے پورا کر دیا جائے اور پھر اس میں جاکر ہم آباد ہو جائیں یہ کوئی بت نہیں ہے کہ پہلے تراش لیا جائے۔ پھر سامنے جاکر کھڑے ہوں۔ زبان کی مثال ایک ایسے بہتے دریا کی ہے جس میں جوش اسی وقت آتا ہے جب اس میں اندرونی طور پر حرکت پیدا ہو۔ زبان میں یہ حرکت اس وقت تک پیدا نہیں ہو سکتی جب تک اسے استعمال نہ کیا جائے۔ اور اس میں لاکھوں دماغوں کے جوش فکر سے سیلاب پیدا نہ کیا جائے۔ حیرت کی بات یہ ہے کہ اتنی لاپرواہی کے باوجود اردو حیرت انگیز ترقی کر رہی ہے۔ وہ کونسی زبان ہے جس میں سب سے زیادہ کتابیں طبع ہوتی ہیں اور فروخت ہوتی ہیں کیا انگریزی کے اخباروں کا اشاعت کے اعتبار سے وہی درجہ ہے جو اس وقت اردو کے اخباروں کا ہے۔

بعض افراد کا خیال ہے کہ غیر زبان کے ذریعہ سے ہی علمی ترقی ممکن ہے اور اس وقت پاکستان میں جو کچھ علمی ترقی ہو رہی ہے وہ انگریزی زبان کے ذریعے سے ہو رہی ہے۔ یہ ظاہر ہے کہ موجودہ ترقی کسی غیر زبان کے ذریعے سے نہیں ہوئی بلکہ قومی زبانوں کے استعمال سے میسر آئی۔ چنانچہ انگریز جن کی تقلید کا ہار ہم اپنے گلے میں اب تک ڈالے ہوئے ہیں۔ اس دن سے اپنی ترقی کی ابتداء شمار کرتے ہیں۔ جب انجیل کا انگریزی میں ترجمہ ہوا اور لاطینی سے انہیں نجات ملی۔

ہم اسلام کا نام تو بات بات پر لیتے ہیں لیکن یہ بھول جاتے ہیں کہ اردو کا اسلام سے گہرا واسطہ ہے دنیا کی کسی زبان میں اسلام سے متعلق اتنا سرمایہ موجود نہیں ہے جتنا اردو زبان میں ہے۔ عربی' فارسی اور ترکی کے تمام اسلامی مواد کو ایک پلڑے میں رکھا جائے اور ان تمام کتابوں کو جو اردو میں شائع ہوئی ہیں۔ دوسرے پلڑے میں رکھا جائے تو اردو کا پلڑا بھاری رہے گا۔

اردو بدقسمتی سے ہمیشہ سے تجدد پسندوں کی کوششوں کا ہدف رہی ہے جو ہر چیز چھوڑنے یا بدل دینے کا مطالبہ کرتے ہیں۔ مثلاً اگر زبان نہیں چھوڑتے تو رسم الخط ہی بدل لیں۔ یا کم از کم اردو اصطلاحات وضع نہ کریں اور انگریزی اصطلاحات ہی چلنے دیں۔ الفاظ کو بدلنا کچھ ایسا آسان نہیں ہوتا ہر لفظ اور اس کے معنی کے درمیان ایک رابطہ ہوتا ہے جس کی جگہ کوئی دوسرا لفظ نہیں لے سکتا۔ زبان میں الفاظ نہ اپنی مرضی سے جاری کیے جا سکتے ہیں نہ اپنی مرضی سے انہیں نکالا جا سکتا ہے۔ الفاظ زبان میں کسی ضرورت کو پورا کرنے کے لیے آتے ہیں اور جب وہ ضرورت پوری ہو جاتی ہے تو خود ہی مر جاتے ہیں کبھی وہ سلاست کے راستے میں سنگ گراں بنتے ہیں

زبان ان سے کترا کر نکل جاتی ہے اگر غیر زبانوں کے ایسے الفاظ زبردستی رائج کر دیے جائیں جو زبان کے مزاج یا اس کی خودداری کے خلاف ہوں تو وہ انہیں موقعہ پاتے ہی نکال کر پھینک دیتی ہے۔

اصطلاحات کے بارے میں بعض لوگ اعتراض کرتے ہیں کہ ہماری اصطلاحات نامانوس ہوتی ہیں۔ کیا اصطلاحات مانوس بھی ہو سکتی ہیں؟ ہر لفظ کا تعلق اس کے معنی سے ہوتا ہے اگر معنی کی حقیقت ایسی ہے کہ اس کے سمجھنے میں دشواری ہوتی ہے تو اس کی حامل اصطلاح بھی بازاری نہیں ہو سکتی اگر برقیہ کو الیکٹرون کہا جائے تو کیا وہ لوگ برقیہ کی کیفیت سے واقف نہیں ہیں۔ یہ سمجھ لیتے ہیں کہ یہ لفظ کس چیز کے لیے استعمال ہوا ہے۔

اصطلاح کے معنی ہی یہ ہیں کہ وہ لفظ کسی خاص معنی میں استعمال کیا جا رہا ہے۔ پھر یہ بھی درست نہیں ہے کہ اصطلاحات اسی زبان کے مرکبات سے بنتی ہیں جن میں وہ استعمال ہوں۔ کیا وہ تمام لاطینی، یونانی اصطلاحات اس وقت یورپ کی زبانوں میں مستعمل ہیں ان ہی زبانوں سے تعلق رکھتی ہیں یا انہیں کلاسیکی زبانوں کی مدد سے بنایا گیا ہے جن میں مشتقات کا امکان موجود ہے؟ اور کیا عربی سے زیادہ مشتقات کا امکان کسی اور زبان میں ہے؟ اور کیا یہ ممکن ہے کہ اصطلاحات کو ایسا عام فہم کر دیا جائے کہ اسے ہر شخص اور ہر بچہ سمجھ سکے؟ عوام اصطلاحات کو اسی حد تک سمجھ سکیں گے جہاں تک ان کا علم ترقی کرے گا اور علم اسی وقت ترقی کر سکتا ہے جب عوام کو ان کی زبان میں سکھایا جائے۔

ہم پر احساس کمتری کا پہلا وار سرسید اور حالی کے زمانے میں ہوا جب بہت سے انگریزی الفاظ بلا ضرورت استعمال کیے گئے لیکن آج کہاں ہیں وہ الفاظ؟ کون کہتا ہے کہ میں آج سپیچ دوں گا یا ہسٹری لکھوں گا یا بیاگرافی ایک عمدہ چیز ہوتی ہے۔ زبان نے ایسے الفاظ کو اپنے اندر سے باہر نکال پھینکا کہ آج کوئی شخص بھولے سے بھی انہیں استعمال نہیں کرتا۔ زبان غیر شعوری طور پر بدلتی ہے اسے کمزور کیا جا سکتا ہے بدلا نہیں جا سکتا۔

کیا اردو میں تعلیم ممکن ہے؟ یہ اہم سوال ہے شروع میں جب انگریزوں کو جدید تعلیم رائج کرنے کا خیال پیدا ہوا تو انہوں نے دہلی کالج کے ذریعے سے اردو میں ہی ابتداء کی عثمانیہ یونیورسٹی میں اس کا پورا پورا تجربہ ہو چکا ہے۔ جامعہ کراچی نے بھی اس کا تجربہ کر کے دیکھا۔ ان کامیاب تجربوں کے بعد اسی قسم کے سوال مہمل ہیں۔

دوسرا سوال یہ ہے کہ اگر انگریزی کو ترک کر دیا گیا تو ہماری ترقی نہیں رک جائے گی۔ کیا ہم دو سو سال انگریزی پڑھنے کے بعد کسی میدان میں جاپان کے ہمسر ہو سکتے ہیں، کیا چین کا مقابلہ کر سکتے ہیں کیا روس کی ترقی کا سبب انگریزی ہے۔ یہ غلط فہمی ہے کہ محض انگریزی ہی ترقی کی ضامن ہے۔ حقیقت یہ ہے کہ جب تک قومی زبان کو صحیح رتبہ حاصل نہیں ہو گا ہم کسی قسم کی ترقی نہیں کر سکتے۔

(ڈاکٹر اشتیاق حسین۔ تلخیص)

Scanned with CamScanner